وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ

سرسید احمد خاں کا نظریۂ حجیتِ حدیث

بحث و تحقیق کے آئینہ میں

بقلم

حبیب الرحمٰن اعظمی

استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

ناشر

مرکز دعوۃ و تحقیق دیوبند، سہارنپور یوپی

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين والعاقبة للمتقين.

اما بعد!

انکار حدیث کے فتنہ کی ابتداء

اسلامی تاریخ میں حدیث وسنت کے ایک قابل قدر حصہ کو نا قابل اعتبار ٹھہرانے کا فتنہ سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں صراط مستقیم سے منحرف فرقۂ خوراج ومعتزلہ وغیرہ نے اٹھایا، یہ گم کردہ راہ فرقے قرآن اور اسلام کے حوالہ سے اپنی خود تراشیدہ جن باتوں کو بحیثیت دین رواج دینے کے درپے تھے چونکہ حدیث رسول کو دین کا ماخذ مانتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا، اس لیے انھوں نے سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ایک بڑے حصے کی حجیت کا انکار کردیا، مگر یہ فتنہ تادیر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ تیسری صدی کے گذرنے کے ساتھ یہ فتنہ بھی گم نامی کی قبر میں دفن ہوگیا، پھر صدیوں تک اسلامی دنیا میں حجیت حدیث کے انکار کی مدہم سی مدہم آواز بھی سنی نہیں گئی، یہاں تک کہ تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دہرایا اور غلام ہندوستان سے سرسید احمد خاں اوران کے فکری رفقاء مولوی چراغ علی، مولوی امیر علی شیعی وغیرہ نے موت کی نیند سوئے فتنہ کو پھر سے جگادیا۔

سرسید خاں نے اگرچہ اپنے فکری فرزندوں کی طرح سرے سے حجیت حدیث

کے انکار کی جسارت تو نہیں کی؛ لیکن حدیث وسنت کے ساتھ انھوں نے اصول محدثین کو نظر انداز کر کے خود رائی کا جو رویہ اختیار کیا اس کا لازمی نتیجہ انکار حدیث کی شکل میں ظاہر ہوا جس کو ان کے فکری جانشین گلے کا طوق بنائے ہوئے ہیں۔

(۱) سرسید خاں نے حدیث کے خلاف انھیں اعتراضات واشکالات کو از سر نو اپنے انداز سے دہرایا جنھیں ان کے پیش رو مستشرقین احادیث کو ناقابل اعتبار باور کرانے کے لیے اٹھا چکے تھے اور علمائے اسلام کی جانب سے جن کے مسکت جوابات دیے جا چکے ہیں۔

(۲) ہر وہ حدیث جو ان کے مزعومہ عقیدۂ قانون فطرت (نیچر) سے ہم آہنگ نہیں ہوتی وہ حدیث خواہ صحیحین (بخاری ومسلم) کی ہی کیوں نہ ہو، ائمہ حدیث اسے صراحتاً صحیح یا حسن کیوں نہ کہتے ہوں اس کو بے توقف بے اصل، موضوع اور از قبیل خرافات قرار دے دیتے ہیں۔

(۳) جو حدیث ان کے تیشۂ تحقیق سے (جو خود ان کا اپنا یا ان کے مقتدایان مغرب کا خود ساختہ ہے) محفوظ رہ گئی ہیں اور ان کے اپنے معیار کے مطابق ثابت وصحیح ہیں، انھیں بھی دو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے: (۱) وہ احادیث جو امور دین سے متعلق ہیں، (۲) وہ احادیث جو امور دنیا سے متعلق ہیں۔ دوسری قسم یعنی امور دنیا سے متعلق احادیث کی تصدیق واطاعت ان کے نزدیک ضروری نہیں، چنانچہ انھوں نے اپنا جو مکتوب حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو بحوالہ پیر جی محمد عارف بھیجا تھا جس میں انھوں نے دین ومذہب کے متعلق اپنی تحقیقات کے بارے میں (جس کی تفصیلات اپنی تصنیفات ومقالات میں بیان کی ہیں) پندرہ اصول تحریر کیے ہیں، اس کی ساتویں اصل میں لکھتے ہیں:

ہفتم: ''دینیات میں سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت میں ہم مجبور ہیں اور دنیاوی امور میں مجاز، اس مقام پر سنت سے مراد احکام ہیں فقط'' (تصفیۃ العقاید، ص ۹، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی ۱۴۳۰ھ)

یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ ان کے خیال میں ادیان و مذاہب کا دائرۂ عمل امور دینیات میں محدود ہے۔ دنیوی معاملات و امور سے دین و مذہب کو کوئی سروکار نہیں ہے، چنانچہ وہ خود واضح اور صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ

''دنیا میں دو قسم کے امور ہیں ایک روحانی اور دوسرے جسمانی، یا یوں کہو ایک دینی اور دوسرے دنیاوی، سچا مذہب امور دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا'' (تہذیب الاخلاق (۲) ص ۱۴۸ بحوالہ خودنوشت افکار سرسید تدوین و تالیف ضیاء الدین لاہوری)

سرسید احمد خاں جب دنیا میں پائے جانے والے امور کو دو قسموں میں تقسیم کر رہے ہیں تو ان کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ دونوں قسم کے امور کی جامع تعریف اور تحدید بھی کر دیتے تا کہ یہ امور آپس میں خلط ملط نہ ہوں، مگر نہ جانے کیوں انھوں نے ان امور کو مبہم رکھا، ہوسکتا ہے کہ یہ ابہام ہی ان کے مفید مقصد ہو، واللہ اعلم

منجانب اللہ مطاع مطلق کے درجہ پر فائز پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں سرسید کے اسی نظریہ کا جائزہ اس تحریر میں پیش کیا گیا ہے۔

سنت رسول کا آئینی مرتبہ کتاب اللہ کی نظر میں

سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کا دینِ اسلام میں بڑا عظیم مقام و مرتبہ ہے، تمام اہل اسلام، بالخصوص فقہائے مجتہدین، سلف صالحین اس بات پر متفق ہیں کہ دین اسلام میں کتاب الٰہی قرآن حکیم کے ساتھ سنت رسول (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کو بھی منجانب اللہ تشریعی و آئینی مقام حاصل ہے، کتاب و سنت اور قرآن و حدیث ہی دین کی اولین اساس و بنیاد ہیں۔ ان دونوں مصادر کی حفاظت اور ان سے اعتنا درحقیقت دین اسلام کی حفاظت و صیانت کی ضامن ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے بارے میں علمائے امت کا یہ اجماعی

اعتقاد دراصل اس بات پر مبنی ہے کہ سنت مطہرہ کو خطاء وزلت سے خدائی عصمت اور تحفظ حاصل ہے، نیز جس طرح قرآن مجید وحی الٰہی ہے، اسی طرح خدائے علیم و قدیر نے سنت کو بھی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی فرمایا ہے، بس فرق یہ کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو۔

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحَىٰ'' (النجم) ''اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے، اس کی بات تو وحی ہے جو اس پر (منجانب اللہ) کی جاتی ہے'' اس آیتِ پاک کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جزم ویقین سے کہی باتیں درحقیقت خدائے پاک ہی کی بتائی ہوئی ہیں، وہ یہ باتیں از خود نہیں بلکہ بحکم خداوندی بیان کرتے ہیں۔

(۲) ایک دوسرے مقام میں قرآن ناطق ہے:

''وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ، قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَ نَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هٰذَا، اَوْ بَدِّلْهُ، قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَائِ نَفْسِيْ ج اِنْ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰى اِلَيَّ، الآية (يونس)

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر ہماری واضح آیتیں تو وہ لوگ جن کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں ہے کہتے ہیں لے آ کوئی قرآن اس کے سوا، یا اسے بدل دے، تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اس کو بدل دوں اپنی طرف سے، میں پیروی کرتا ہوں اسی کی جو وحی کی جائے میری طرف''۔

اس مقدس آیت میں اللہ عزّ وجل نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ میرے رسول کا قول وعمل وحی الٰہی کے تابع ہوا کرتا ہے۔ وہ عام طور پر وہی کرتے اور کہتے ہیں جس کا منجانب اللہ انھیں حکم ہوتا ہے۔

(۳) ایک اور مقام پر فرمانِ خداوندی ہے:

''وَاِنَّكَ تَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ o صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي

السَّمٰوٰت وَمَا فِی الْاَرْضِ اَلَا اِلَی اللّٰہِ تُصِیْرُ الْاُمُوْر'' (الشوری)

''بیشک تو رہنمائی کرتا ہے سیدھی راہ کی، اللہ کے راستہ کی، جس کی آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں ہیں، خبردار رہو کہ اللہ ہی کی طرف سب امور لوٹتے ہیں''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل کے ذریعہ بندگانِ خدا کو دین ودنیا کی جو سیدھی راہ دکھائی اور ان کی رہنمائی کی ہے اس کی یہ ثنائے بلیغ اور توصیف عظیم، حتی کہ اسے صراط اللہ اور ہدایتِ ربانی قرار دینا بجائے خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سنت رسول (یعنی آپ ﷺ کا قول وفعل) وحی الٰہی ہی ہے جس کے حق وصواب ہونے میں ادنیٰ تردد کی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) سورۂ الاحزاب میں حکم ربّانی ہے:

''وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ'' الآیۃ.

''اور کسی مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو لائق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے تو انھیں اپنے کام میں اختیار باقی رہے''۔

عربی زبان کے قواعد سے واقف جانتے ہیں کہ شرط کے ساتھ نکرہ کا استعمال عموم معنی کے لیے ہوا کرتا ہے، لہٰذا آیت پاک میں لفظ ''اَمْرًا'' عام ہے جو دینی ودنیوی سب امور کو شامل ہوگا، پھر شانِ نزول سے بھی اس کی مزید تائید ہوتی ہے، کیونکہ آیت شریفہ حضرت زینب بنت جحش اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے رشتۂ نکاح سے متعلق نازل ہوئی ہے[۱]، حضرت زینب اور ان کے بھائی کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا؛ لیکن اس آیت کے نازل ہونے پر انھوں نے اپنی رضا کے بالمقابل اللہ اور رسول کی مرضی ہی کو ترجیح دی، کون نہیں جانتا کہ مرد وعورت کا باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا ایک انسان کی اپنی شخصی زندگی سے تعلق رکھتا ہے

(۱) شانِ نزول کے لیے دیکھئے تفسیر طبری ج۹ ص۱۱۳۔

جب اس جیسے معاملہ میں بھی اللہ کے رسول کے فیصلہ کے بجائے اپنی رائے اور پسند کو اختیار کرنا بحکم خداوندی مؤمن کی شایان شان نہیں تو پھر دیگر دنیاوی امور ومعاملات میں رسولِ خدا کی حدیث کو نظر انداز کرنا کیونکر درست ہوسکتا ہے۔

کتاب اللہ کی ان مذکورہ آیتوں کے علاوہ وہ آیتیں جن میں علی الاطلاق آپ ﷺ کی اطاعت اور پیروی کا حکم ہے وہ بھی اپنے اطلاق وعموم کی بناء پر یہی بتارہی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل خواہ دین سے متعلق ہو یا دنیا سے واجب الاتباع ہے، بطور مثال کے اس نوع کی چند آیات نقل کی جارہی ہیں:

(۵) ”یَا اَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا اَطِیعُوا اللّٰہَ واَطِیعُو الرَّسُولَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنکُمْ، فَاِنْ تَنَازَعْتُم فِی شیءٍ فَرُدُّوْہ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُولِ اِنْ کُنْتُم تُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الآخِر“ الآیۃ (النساء)

”اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان کی بھی جو تم میں اہلِ حکومت ہیں، پھر اگر کسی امر میں تمہارا باہم اختلاف ہوجائے تو تم (اس کے تصفیہ کے لیے) اللہ اور رسول کی جانب رجوع کرو، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو“۔

یہ آیت پاک درج ذیل احکام پر مشتمل ہے:

(الف) ”اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُو الرسولَ“ اللہ رب العزت نے اس فرمان کے ذریعہ اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کو واجب ٹھہرایا ہے اور ”الرَّسول“ کے ساتھ ”اَطیعوا“ کا اعادہ فرما کر یہ واضح کیا ہے کہ رسول کی پیروی بھی مستقل طور پر واجب ہے، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی بات کا حکم دیں خواہ وہ قرآن مجید میں پائی جائے یا نہ پائی جائے، پھر وہ حکم دنیا سے متعلق ہی کیوں نہ ہو، اس کا قبول کرنا امت پر لازم ہوگا، کیوں کہ آپ کو ”الکتاب“ اور اسی کی طرح واجب الاتباع حکمت وسنت بھی عطا کی گئی ہے۔

(ب) ”اُولِی الاَمْر“ سے فعل اطیعوا کو حذف کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ اہل

حکومت کی اطاعت و پیروی ''الرسول'' کے تابع ہے، لہٰذا ان کا وہی حکم لائق اتباع ہوگا جو حکم رسول کے موافق ہو، بصورت اختلاف حکام کا حکم لائق اتباع نہیں ہوگا۔

(ج) "فَاِنْ تَنَازَعْتُم فِی شَیْءٍ" سے معلوم ہوا کہ بعض احکام میں اہل ایمان میں باہم نزاع واختلاف ہوسکتا ہے، یہ نزاع واضح، غیر واضح، بڑے چھوٹے ہر طرح کے حکم میں ہوسکتی ہے، نیز اس نزاع واختلاف کے باوجود وہ صفت ایمان سے متصف رہیں گے اس سے الگ نہیں ہوں گے۔

(د) "فَرُدُّوْہ اِلی اللّٰہِ والرَّسولِ" آیت پاک کا یہ جملہ بتارہا ہے کہ ملت اسلامیہ کے تمام متنازع مسائل کا حل کتاب اللہ وسنت رسول اللہ میں موجود ہے، کیونکہ نزاعی مسئلہ میں کتاب الٰہی اور سنت نبوی کی حیثیت قولِ فیصل کی نہ ہوتی تو اس کے تصفیہ کے لیے ان کی جانب ردّ ورجوع کا حکم کیوں دیا جاتا۔

علمائے حق کا اس پر اتفاق ہے کہ "ردّ الی اللّٰہ" سے مراد قرآن حکیم کی جانب رجوع کرنا ہے اور "ردّ الی الرسول" کا معنی یہ ہے کہ آپؐ کی حیات میں خود آپؐ کی ذات والاصفات کی جانب اور بعد از وفات آپ کی احادیث وسنن کی طرف مراجعت کی جائے گی۔

(ھ) "ان کنتم تؤمنون باللّٰہ الخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ نزاعی معاملات میں قرآن وحدیث کی جانب رجوع شرائط ایمان میں سے ہے، آیت مبارکہ کے اس آخری حصہ سے صاف طور پر معلوم ہورہا ہے کہ جماعتِ مسلمین کے معاملات ومسائل میں اصل دلیل وحجت قرآن وحدیث ہی ہیں، ان کی حجیت کا اعتقاد ایمان کی شرائط میں سے ہے۔

(۶) اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُولَ فَاِن تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُولِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ" (التغابن)

''اللہ تعالیٰ کی پیروی کرو اور رسول اللہ کی پیروی کرو، پھر اگر تم نہ مانو تو ہمارے رسول پر تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے''۔

اس آیت کریمہ سے بھی دین و دنیا کی کسی قید کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ احکام کی اتباع و پیروی کا وجوب ثابت ہو رہا ہے۔ آپ کا صادر کردہ حکم وحی الٰہی کے تحت ہو، یا ایسے اجتہاد سے ہو جسے منجانب اللہ برقرار رکھا گیا ہے، بہر صورت آپ کے حکم کو صحیح و درست ماننا اور اس کے مطابق عمل کرنا واجب اور ضروری ہے۔

(۷) "مَنْ يُطِعِ الرَّسولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا" (النساء)

"جس نے رسولِ خدا کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے (اطاعت سے) منہ موڑا تو ہم نے تجھے ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ہے (کہ انھیں سرتابی نہ کرنے دو)

اس ارشاد خداوندی میں بھی علی الاطلاق رسول اللہ کی پیروی کو اللہ تعالیٰ کی پیروی بتایا گیا ہے، کیونکہ آپ کا ہر قول و فعل ابتدائی طور پر یا مآل و انجام کے لحاظ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی عین منشاء و مرضی کے مطابق ہوتا ہے، جو بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہو رہا ہے، لیکن فی الحقیقت وہ خدائے علیم و خبیر ہی کا حکم ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(۸) "وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُم عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُو اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ العِقَابِ" (الحشر)

"اور جو دے تم کو الرسول سو لے لو، اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو اور ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ سخت عقاب والے ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست تلامذہ صحابۂ کرام اس آیت پاک کا کیا معنی و مطلب سمجھتے تھے اس کی وضاحت فقیہ الامت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس صحیح حدیث سے ہوتی ہے جس کی تخریج بخاری و مسلم نے متفقہ طور پر کی ہے۔

عن عبد اللّٰه بن مسعود قال: لعن اللّٰه الواشمات، والمستوشمات، والنامصات، والمتنمصات، والمتفلجات للحسن، المغيرات خلق اللّٰه، فبلغ ذلك امرأة من بنی الاسد يقال لها: ام يعقوب، وكانت تقرأ القرآن، فأتته فقالت: ما حديث بلغنى عنك؟ انك لعنت الواشمات والمستوشمات، والمتنمصات، والمتفلجات للحسن المغيرات لخلق اللّٰه؟ فقال عبداللّٰه: وما لی لا العن مَن لعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم، وهو فی كتاب اللّٰه؟ فقالت المرأة: لقد قرأت ما بين لوحتی المصحف فما وجدته؟! فقال: لئن كنتِ قرأتيه لقد وجدتيه قال اللّٰه تعالیٰ: "وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُم عَنْهُ فانتهوا"

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کی لعنت ہے بغرض خوبصورتی گودنا گودوانے والیوں پر اور گودنے والیوں پر اور بالوں کو نوچنے والیوں اور دانتوں کو باریک کرنے والیوں پر یہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کرنے والی ہیں، عبداللہ بن مسعود کی یہ بات ام یعقوب نامی قبیلہ بنو اسد کی ایک عورت کو پہنچی تو وہ ان کے پاس آئی اور کہا کہ یہ کیسی بات ہے جو آپ کے حوالہ سے مجھ تک پہنچی ہے کہ آرائش کی غرض سے گودنا گودوانے والیوں اور گودنے والیوں پر اور بالوں کو اکھاڑنے والیوں اور دانتوں کو پتلا کرنے والیوں پر آپ لعنت بھیجتے ہیں؟ تو حضرت عبداللہ نے کہا میں ان پر کیوں نہ لعنت بھیجوں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے اور یہ لعنت کتاب اللہ میں بھی ہے، ام یعقوب نے کہا میں نے پورا قرآن پڑھا ہے مجھے تو اس میں یہ لعنت نہیں ملی، عبداللہ بن مسعود نے فرمایا تو غور سے پڑھتی تو اس کو پالیتی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "مَا اتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهو" یعنی جب قرآن میں یہ حکم خداوندی ہے کہ اللہ کے نبی جو حکم دیں وہ کرو جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ، تو چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مذکورہ عورتوں پر لعنت بھیجی ہے تو اس آیت کے عموم میں یہ لعنت داخل ہوگی، گویا اللہ

تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ رسول کی اس لعنت کی اتباع میں تم بھی ان پر لعنت بھیجو۔

پھر یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اللہ عزّ وجل نے دین ودنیا کی کسی قید کے بغیر عمومی طور پر نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی اطاعت واتباع کرنے والوں کی مدح وتحسین فرمائی ہے، نیز آپؐ کی سیرت طیبہ کو اسوۂ حسنہ اور بہترین نمونہ قرار دے کر آپؐ کی اتباع وپیروی کی دعوت وترغیب دی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

(۹) "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰه فَاتَّبِعُوْنِی يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِر لَكُم ذُنُوْبَكُم وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ" (آل عمران)

''کہہ دو اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو تم اللہ کے محبوب ہو جاؤ گے اور وہ تمہارے گناہوں کی بخشش کردے گا اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

یہ پاک آیت اس کی روشن دلیل ہے کہ آپ کی سیرت طیبہ وسنت مطہرہ کو بارگاہ الٰہی میں محبوبیت کا ایسا اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے کہ اس کی اتباع وپیروی کرنے والے بھی خدائے غفور ورحیم کے محبوب ہو جاتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کی پیروی مطلق کی اس بلیغ دعوت وترغیب کے بعد کیا ہم بندوں کے لیے اس کی گنجائش ہے کہ ہم کہیں کہ دینی امور سے متعلق سنت نبوی ہمارے لیے نمونۂ عمل ہے، مگر دنیاوی امور ومعاملات کے بارے میں وارد سنتِ محبوب الٰہی ہمارے واسطے مینارۂ ہدایت نہیں ہے، ہم مختار ہیں چاہے سنت نبوی پر عمل کریں اور چاہے اسے چھوڑ کر کوئی اور ڈگر اختیار کرلیں۔ کتنے واضح الفاظ میں قرآن مقدس کا بیان ہے:

(۱۰) "اِنَّ لَكُمْ فِی رَسُول اللّٰه اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهِ كَثِيْرًا" (الاحزاب)

''یقیناً تمہارے لیے (سنت) رسول اللہ میں بہترین نمونہ ہے، ان لوگوں کے لیے جو اللہ (سے ملنے) اور آخرت (کا ثواب حاصل کرنے) کی امید رکھتے

ہیں، اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔

یعنی اللہ کی لقا اور آخرت کے ثواب کے امیدواروں کو چاہیے کہ ہر معاملہ میں خواہ وہ دین سے متعلق ہو یا دنیا سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کو اپنے لیے نمونہ بنائیں، نیز ہمت و استقلال میں آپ کے طریقہ کی پیروی کریں۔

علاوہ ازیں کلام اللہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و سنن کو لفظ ''حکمت'' سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سنت رسول اللہ کی صرف اتباع و پیروی ہی نہیں؛ بلکہ اس کی تعظیم و تکریم بھی مقصود ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ مِن آياتِ الله وَالْحِكْمَة“ الآية (الاحزاب)

''ان آیات وحکمت (سنن) کو یاد کرو جو تمہارے گھروں میں تلاوت کی جاتی ہیں''۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے گھروں میں قرآن وحدیث ہی کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔

ایک دوسرے موقع پر ہے: ”وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَم“ الآية (النساء)

''اور نازل کیا اللہ نے تم پر کتاب وحکمت (سنت) اور تم کو سکھائیں وہ باتیں جو تو جانتا نہیں تھا۔''

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

”وَاذْكُروا نِعمَةَ اللّٰه عَلَيكم وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْكُم من الكتاب وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِه“ الآية (البقرة)

''اور یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے اور کتاب وحکمت (سنت) کو جو تم پر اتاری، اللہ تمہیں اس کی نصیحت کرتا ہے۔

ان سب آیتوں میں حکمت سے مراد ائمہ مفسرین کے راجح قول کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ اور احادیث مبارکہ ہی ہیں۔ آخر کی

دونوں آیتوں میں ''الکتاب'' کی طرح ''الحکمۃ'' یعنی سنت کے منزل من اللہ ہونے کی تصریح ہے، جس سے صاف طور پر معلوم ہوگیا کہ اللہ کی نبی کی سنتیں بھی وحی الٰہی ہیں (اگرچہ غیر متلو) تو جب بحکم خداوندی یہ احادیث وسنن وحی الٰہی ٹھہریں تو یہ چاہے دینی امور سے متعلق ہوں یا دنیاوی کاموں سے ان کا تعلق ہو بغیر کسی تفریق کے ان پر عمل آوری لازم ہوگی، کیونکہ کسی بندہ کو از روے شرع وعقل اس کی گنجائش کہاں ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کے احکام وفرامین میں اپنی طرف سے یہ تقسیم وتفصیل کرے کہ فلاں حکم کی بجا آوری ہم پر لازم ہے اور فلاں فرمان کے بارے میں ہم مختار ہیں چاہے عمل کریں یا نہ کریں۔

پھر قرآن واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے رسول کو مکلّف کیا ہے کہ اسی طریقہ پر چلیں جو بذریعہ وحی ربانی آپ کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

(الف) "ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الذين لَا يَعْلَمُوْن" (الجاثية)

''پھر ٹھہرایا ہم نے تجھ کو دین کے ایک راستہ پر سوتو اسی پر چل اور مت چل نادانوں کی خواہشوں پر''۔

(ب) "وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ اِنّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا" (الاحزاب)

''پیروی کیجیے اس کی جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہے تمہارے رب کی جانب سے بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم لوگ کرتے ہو خبر رکھتا ہے۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بھی پابند بنایا گیا ہے کہ وحی ربانی کے ذریعہ جو شرائع واحکام آپ کو دیئے گئے ہیں انھیں امت تک پہنچادیں۔

"يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ" (المائدة)

''اے رسول پہنچادے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے''۔

اللہ کے رسول نے اپنے اقوال وافعال بالفاظ دگر احادیث وسنن کے ذریعہ اسی شریعت الٰہیہ اور دینی طریقہ کو امت سے بیان فرمایا ہے، قرآن وحدیث سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ احادیث وسنن میں دین ودنیا دونوں کے بارے میں احکامات وہدایات موجود ہیں، لہٰذا ان سب احکامات وہدایات پر عمل درآمد کے بغیر اللہ تبارک وتعالیٰ کی مقرر کردہ شریعت پر عمل کا تصور ممکن نہیں ہے۔

علمائے اسلام کے یہاں یہ امر معلوم ومحقق ہے کہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے وظائف میں ایک اہم ترین وظیفہ کلام اللہ کی تفسیر وبیان بھی ہے، ارشاد ربانی ہے:

"وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ" (النحل)

"اور ہم نے اتاری تجھ پر یادداشت (قرآن) تاکہ تو (اس کے مضامین کو) لوگوں کے لیے خوب کھول کر بیان کردے جو ان کی طرف اتارا گیا ہے۔"

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث وسنن کے ذریعہ درحقیقت اپنی اسی پیغمبرانہ ذمہ داری کی تکمیل فرمائی ہے، لہٰذا جس طرح اس بیان وتفسیر کے متن یعنی قرآن مجید کے ایک ایک حرف کی تصدیق وامتثال ایک بندۂ مؤمن پر لازم ہے اسی طرح اس متن کی تفسیر وبیان کی تصدیق وامتثال اور پیروی بھی بغیر کسی تفریق کے اہل ایمان کا ایمانی وظیفہ ہے، کیونکہ کتاب وسنت کے مابین یہ (متن وشرح کا) رابطہ عقلی وشرعی طور پر اسی کا متقاضی ہے۔ اس لیے قرآنی احکام میں جب یہ تفصیل وتقسیم کہ یہ حکم دین سے متعلق ہے لہٰذا ہم اس کے پابند ہیں اور یہ از قبیل دنیا ہے ہم اس کے مطابق عمل کرنے اور نہ کرنے میں مختار ہیں جہالت وضلالت ہے، بعینہٖ قرآن کی اس تفسیر نبوی میں بھی یہ تقسیم جہالت وضلالت ہی شمار ہوگی۔

سنت رسول کی تشریعی وآئینی حیثیت کے ثبوت پر انھیں مذکورہ قرآنی دلائل پر اکتفاء کیا جارہا ہے، کیونکہ یہ مختصر تحریر اس سے زیادہ کی متحمل نہیں ہے، ویسے ایک

مؤمن صادق اور پیروِحق کے لیے تو صرف ایک حکم خداوندی ہی کافی وشافی ہے۔

اللہ کے نبی کی نظر میں احادیث کی آئینی حیثیت

اب آیندہ سطور میں موضوع زیر بحث سے متعلق چند احادیث نقل کی جارہی ہیں، جس سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ خود اللہ کے نبی پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اپنی احادیث وسنن کی قانونی وآئینی حیثیت کیا ہے؟

(۱) عن عبد اللّٰہ بن عمرو رضی اللّٰہ عنھما قال: کنت اکتب کل شيء اسمعه عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، ارید حفظه فنھتني قریش، فقالوا: انك تکتب کل شيء تسمعه من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ورسول اللّٰہ بشر، یتکلم فی الغضب والرضاء! فاسکتّ عن الکتاب، فذکرت ذلك لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، فقال: اکتب فوالذی نفسی بیده ما خرج منه الا حق واشار الی شفتیه صلی الله علیه وسلم (اخرجه الامام احمد وابوداؤد وغیرھما وھو حدیث صحیح)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں ہر وہ حدیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا اسے لکھ لیا کرتا تھا، اس سے میرا مقصد احادیث کی حفاظت تھی، تو قریش (کے بعض افراد) نے مجھے اس سے روکا اور کہا کہ تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہر حدیث لکھ لیتا ہے حالانکہ رسول اللہ ایک بشر اور انسان ہیں غصے اور رضا مندی کی حالتوں میں گفتگو فرماتے ہیں، تو میں لکھنے سے رک گیا اور یہ پوری بات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، تو آپؐ نے فرمایا: لکھتے رہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس سے حق ہی صادر ہوتا ہے اور اپنے مبارک ہونٹوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

اس حدیث پاک میں کسی استثناء کے بغیر ہر اس حدیث کے لکھنے کا حکم ہے جو آپ کی زبان وحی ترجمان سے صادر ہوئی اور اس صراحت کے ساتھ کہ خوشی

وناخوشی ہرحال میں آپؐ کے منھ سے حق بات ہی نکلتی ہے۔ حالانکہ ایک بشر سے بحالت خفگی احتیاط کے باوجود نامناسب ونادرست کلمات نکل جاتے ہیں، لیکن اللہ کے رسول کا معاملہ اس سے بالاتر ہے، حفاظت خداوندی حالت رضاء کی طرح عالم غضب میں بھی آپ کو جادۂ حق پر قائم ودائم رکھتی ہے، لہٰذا آپ سے حق وصواب ہی کا صدور ہوگا۔

(۲) عن المقدام بن معدی کرب الکندی قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: الا انّی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ، الا یوشک رجلٌ شبعان علی اریکتہ یقول: علیکم بھذا القرآن، فما وجدتم فیہ من حلال فاحلّوہ، وما وجدتم فیہ من حرام فحرّموہ، الحدیث (سنن ابی داؤد کتاب الاطعمہ فی باب النھی عن اکل السباع)

بغور سنو! بیشک مجھے (اللہ کی جانب سے ''الکتاب'' دی گئی ہے اور الکتاب کے ساتھ اسی جیسی (واجب العمل حدیث وسنت بھی دی گئی ہے) خبردار رہو! قریب ہے کہ آسودہ حال شخص اپنی آراستہ سیج پر (ٹیک لگائے) کہے گا کہ اسی قرآن کو لازم پکڑو پس اس میں جو چیز حلال سے پاؤ اسے حلال مانو، اور جو چیز اس میں از قبیل حرام پاؤ اسے حرام جانو الخ۔

یہ حدیث پاک اس بارے میں نص ہے کہ سنت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام بھی قرآن کے مثل ہے، یعنی جس طرح قرآن عزیز منزل من اللہ اور واجب العمل ہے، اسی طرح احادیث رسول بھی وحی الٰہی اور واجب الامتثال ہیں، لہٰذا سنت رسول سے نظر پھیر کر صرف قرآن مقدس پر عمل کا دعویٰ بایں دلیل کہ شریعت اسلامی پر عمل درآمد کے لیے قرآن کافی ہے حدیث کی ضرورت نہیں، دعویٰ باطل ہے جو بلادت وجہالت کی پیداوار ہے، کیونکہ ہم بندوں کے لیے احادیث رسول کی تشریحات وتوضیحات کے بغیر براہ راست قرآن پر مکمل طور سے عمل ممکن ہی نہیں ہے۔

حدیث کی حجیت پر اجماع ہے

پوری علمی ذمہ داری سے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ حضرات صحابہ کے عہد خیر وصلاح سے عصر حاضر تک اکابر محدثین، ائمۂ مجتہدین اور علماء حق کی صف میں ایک فرد کی بھی نشاندہی نہیں کی جاسکتی ہے جس نے حدیث رسول کو حدیث مانتے ہوئے اس کی حجیت کا انکار کیا ہو، چنانچہ امام شافعیؒ متوفی ۲۰۴ھ فرماتے ہیں:

(١) ولا اعلم من الصحابة، ولا من التابعين احدًا أُخبر عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الا قبل خبره وانتهى اليه واثبتا ذلك سنة... وقال الشافعي: وصنع ذلك الذين بعد التابعين. والذين لقيناهم، كلهم يثبت الاخبار ويجعلها سنة، يُحمد من تبعها ويُعاب من خالفها، فمن فارق هذا المذهب كان عندنا مفارق سبيل اصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، واهل العلم بعدهم الى اليوم، وكان من اهل الجهالة (مفتاح الجنة للسيوطی ص ٣٢، ٤٢)

حضرات صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ہر ایک کے بارے میں میری معلومات یہی ہے کہ جب بھی انھیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی خبر دی گئی تو اسے قبول کیا، اسی پر جم گئے اور اسے اپنا طریقہ بنالیا۔

آگے فرماتے ہیں:

یہی طرز عمل تبع تابعین اور ان علماء کا تھا جن سے میری ملاقات ہوئی ہے، یہ سارے کے سارے حضرات اخبار رسولؐ پر قائم رہتے اور اسے اپنا طریقہ بنالیا کرتے تھے، اور جو حدیث کی پیروی کرتا اس کی مدح وستائش کی جاتی اور جو اس کی مخالفت کرتا اسے معیوب سمجھا جاتا تھا، لہٰذا جو شخص اس مذہب سے الگ ہوگا وہ ہمارے نزدیک اصحاب رسول اور ان کے بعد کے آج تک کے علماء دین کے راستہ کو چھوڑنے والا اور اہل جہالت سے ہوگا۔

(۲) امام ابن حزم ظاہری متوفی ۴۵۶ھ مراتب اجماع میں لکھتے ہیں:

واتفقوا ان كلام رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا صحّ انه كلامه بيقين فواجب اتباعه... واتفقوا انه لا يحل ترك ما صح من الكتاب والسنة ص ۱۷۵ (بحواله اضاء ات بحثية فی علوم السنة النبويه ص ۵۰)

علماء کا اتفاق ہے کہ جب صحیح طور پر ثابت ہو جائے کہ یہ بالیقین کلام رسول (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) ہے تو اس کی اتباع واجب ہے...اور علماء کا اتفاق ہے کہ کتاب وسنت سے جس چیز کا ثبوت صحیح طور پر ثابت ہو جائے اس کا ترک حلال و جائز نہیں ہے۔

(۳) حافظ، محقق کمال الدین ابن ہمام متوفی ۸۶۱ صراحت کرتے ہیں کہ

حجية السنة ضرورية (التقرير والتحبير شرح التحرير ج۲ ص ۲۳۵، حدیث کی حجیت دین میں (بدرجہ) بدیہی ہے۔

(۴) اور حافظ ابن ہمام سے پہلے علامہ سعد الدین تفتازانی متوفی ۷۹۲ھ نے بھی یہی تصریح کی ہے، چنانچہ التلویح ج۱ ص ۱۳۸ میں لکھتے ہیں: كون الكتاب والسنة حجة بمنزلة البديهی (بواسطہ حجیۃ السنہ ص۲۴۸، از ڈاکٹر عبدالغنی مصری متوفی ۱۴۰۳ھ) قرآن وحدیث کا حجت ہونا بدرجۂ بدیہی ہے۔

حدیث کی حجیت چونکہ بمنزلۂ بدیہی ہے اور باتفاق فقہاء دین کے بدیہی احکام کے انکار سے منکر دائرۂ اسلام سے نکل جاتا ہے اس لیے امام جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

ان من انكر كون حديث النبی صلى الله عليه وسلم قولاً كان او فعلاً. بشروطة المعروفه فی الاصول حجة كفر وخرج عن دائرة الاسلام، وحشر مع اليهود والنصارىٰ او مع من شاء الله من فرق الكفرة. (مفتاح الجنة فی الاحتجاج بالسنة ص۲)

بلا شبہ جس نے حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خواہ وہ قولی ہو یا فعلی انکار کیا جبکہ اس میں اصول حدیث میں مذکور معروف شرطیں موجود ہیں (یعنی وہ حدیث مقبول ومعمول بہ ہے) تو وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہوگیا، اس کا حشر یہود ونصاریٰ یا مشیت الٰہی کے مطابق کسی کافر فرقے کے ساتھ ہوگا۔

ایک اشکال اور اس کا حل

جمہور علماء دین کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ بعض ان پیش آمدہ مسائل ومعاملات میں جن میں منجانب اللہ آپ ؐ کو کوئی ہدایت نہیں ملی تھی بوقت ضرورت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے حکم صادر فرمائے ہیں اور اجتہاد میں صواب وخطا دونوں کا احتمال ہوتا ہے، اس لیے سنت رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کو علی الاطلاق اور عمومی طور پر وحی قرار دینا جو ہر طرح کی غلطی سے بری اور پاک ہوتی ہے، کیسے درست ہوسکتا ہے؟

اس بارے میں عرض ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر احکام ہدایت ربانی کے تحت ہی صادر ہوا کرتے تھے، سنن رسول کا غالب اور اکثر سے زائد حصہ وحی الٰہی پر ہی مشتمل ہے، رہے دین ودنیا کے وہ معاملے جن میں آپ ؐ نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ فرمایا ہے اس میں یہ تفصیل ہے کہ رب علیم وخبیر نے آپ ؐ کے جس اجتہادی حکم کو بحالہ برقرار وثابت رکھا ہے (آپ کے اجتہادی احکام اکثر ایسے ہی ہیں) تو اس تقریر سے اس کا منشائے ربانی کے مطابق ہونا ظاہر ہے، اور اگر وحی الٰہی (خواہ وہ متلو ہو یا غیر متلو) کے ذریعہ آپ پر یہ حقیقت منکشف کردی گئی کہ اس حکم اجتہادی میں مراد ربانی تک آپ ؐ کے فکر واجتہاد کی رسائی نہیں ہوسکی ہے، اس کے بجائے حکم الٰہی یہ ہے، اس تنبیہ وتصویب کے بعد اسی تصویبی اور اصلاح شدہ حکم کو آپ نے بیان کیا ہے، تو اس صورت کا بھی رضائے خداوندی کے مطابق ہونا واضح ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اجتہادات انھیں دو صورتوں میں دائر ہیں

کہ یا تو احکم الحاکمین نے اپنی تقریر کے ذریعہ اس کی تصویب فرمادی ہے، یا اس کی اصلاح فرمادی ہے اور آپ نے اسی درست شدہ حکم کو امت تک پہنچایا ہے، لہٰذا رسولِ خدا کے اجتہادی فرمودات بھی بہر صورت رضائے الٰہی کے عین مطابق ہیں، کیونکہ یہ اجتہادی احکام اپنے ابتدائی مرحلہ میں اگرچہ وحی ربانی سے متصف ومؤید نہیں ہیں، لیکن اپنے مآل وانتہاء میں یقینی طور پر رب کریم کی وحی سے فیض یاب ہیں، اس لیے سنت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام پورے طور پر ایسی بات سے محفوظ ہے جس سے اس کی تصدیق وتعمیل میں کسی نوع کا تردد وشبہ کیا جاسکے۔

اس وضاحت سے یہ حقیقت صبح روشن کی طرح آشکارا ہوگئی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اقوال وافعال بطریق وحی غیر متلو صادر ہوئے ہیں، یا جن اخبار واحکام کو آپ نے بطور اجتہاد بیان فرمائے ہیں یہ سب اپنی ابتداء یا انتہاء میں ثابت بالوحی ہیں، اور تصدیق وتعمیل کے لحاظ سے سب یکساں ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہے، اوپر مذکور قرآنی نصوص کے عمومات سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے کہ سنت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام علی الاطلاق بغیر کسی تخصیص کے واجب التعمیل ہیں، اور بحیثیت ایک مسلمان کے ہم پر اس کی تشریعی وآئینی حیثیت کو تسلیم کرنا لازم ہے، علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ونبی تسلیم کرنے کا بھی تقاضا ہے کہ آپ کی ہر خبر جازم کی صداقت کا اعتراف اور ہر صریح امر ونہی کا امتثال اور فرمانبرداری کی جائے، البتہ جو حکم آپ نے بطور ظن وگمان یا بطریق مشورہ وغیرہ بیان کیے ہیں وہ خود آپ ہی کے حکم کے مطابق واجب التعمیل نہیں ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ایک ضروری تنبیہ

جب علماء حق یہ کہتے ہیں کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور پیروی علی الاطلاق واجب ہے، تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہر حدیث پر عمل بدرجۂ

وجوب لازم ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث پاک جس امر پر دلالت کررہی ہے اس امر کی بجا آوری کسی نہ کسی درجہ میں لازم اور ضروری ہے، لہٰذا اگر بقواعد اصول حدیث وفقہ حدیث کے الفاظ وجوب کو بیان کررہے ہیں تو اس کا کرنا واجب ہوگا، اگر حرمت کے معنی پر دلالت کررہے ہیں تو اس امر کا ترک لازم ہوگا، اگر اس سے سنت واستحباب کا ثبوت ہورہا ہے تو اس کا کرنا سنت ومستحب ہوگا، اگر الفاظ حدیث کراہت کے معنی پر دلالت کرتے ہیں تو اس کا کرنا مکروہ ہوگا، اور اگر اباحت کا اثبات ہورہا ہے تو اس امر کا کرنا مباح ہوگا، بہرصورت کسی نہ کسی درجہ میں اس پر عمل ضروری ہوگا، ''تدبّر''۔

سرسید احمد خاں کا خود تراشیدہ نظریہ

اوپر مذکور قرآنی آیات اور احادیث رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام وغیرہ کی بناء پر علماء اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث (بشرطیکہ منسوخ یا دیگر احادیث کے معارض نہ ہوں) مطلقاً واجب العمل اور اسلامی احکام میں حجت ہیں۔

اس کے برخلاف سرسید احمد خاں مدعی ہیں کہ دنیاوی امور ومعاملات سے متعلق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وسنن کی اتباع وپیروی لازم نہیں ہے؛ بلکہ ان امور میں اصل اعتبار دنیوی مصالح اور منافع کا ہے، جن سے کاروبار دنیوی کا علم وتجربہ رکھنے والے ہی واقف ہوتے ہیں، لہٰذا دنیاوی امور میں وہ احادیث کی پیروی کے بجائے اپنے علم وتجربہ پر عمل کریں گے، وہ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں حدیث پاک "انتم اعلم بامور دنیاکم" پیش کرتے ہیں، (یعنی تم لوگ اپنے دنیاوی کاموں کو زیادہ جانتے ہو)

یوں تو سرسید احمد خاں دین کی فہم وتشریح میں احادیث پر مشکل ہی سے اعتماد کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک حدیث کے ثبوت میں بہت سارے خدشات

وشبہات ہیں، جنھیں انھوں نے اپنی تحریروں میں تفصیل سے ذکر کیے ہیں، ان کا اس موقع پر ذکر باعث طوالت ہوگا، اگرچہ یہ وہی فرسودہ اشکالات ہیں جو ان کے پیش رو مستشرقین اور ان سے بہت پہلے فرقۂ معتزلہ سے وابستہ بعض فریب خوردۂ عقل وہوس بیان کر چکے ہیں اور علمائے حق کی طرف سے ان کے مدلل ومسکت جوابات دیے جا چکے ہیں۔

علاوہ ازیں احادیث کی اقسام متواتر، مشہور اور احاد میں سے احادیث متواترہ کو تو وہ بے چون وچرا لائق قبول سمجھتے ہیں اور احادیث مشہورہ میں جو ان کی اپنی خودساختہ تحقیق کی رو سے قابل اعتماد ہیں (جو اقل قلیل ہی ہیں) انھیں بھی قبول کرنے سے ان کو اِبا وانکار نہیں ہے، لیکن احادیث آحاد کو (جو احادیث کی اقسام میں سب سے زیادہ ہیں اور بالعموم احکام شرعیہ کا مدار انھیں پر ہے) قبول کرنے کی طرف ان کا میلان نہیں ہے، پھر اس طرح ان کے تیشۂ تنقید وتحقیق سے جو حدیثیں محفوظ بچ گئی ہیں انھیں بھی دو خانوں میں بانٹ دیا ہے: (۱) دینی معاملات ومسائل جن کے بارے میں وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات واحکامات کی تشریعی حیثیت تسلیم کرتے ہیں، (۲) دنیاوی امور ومعاملات، ان میں سنت رسول کا آئینی مقام ومرتبہ ان کے نزدیک مسلم نہیں ہے، کاروبار دنیا میں شرعی احکام کی بجا آوری کے بجائے اپنے علم وتجربہ کے مطابق عمل میں وہ اپنے آپ کو مجاز اور آزاد باور کرتے ہیں، اس تقسیم سے انھوں نے اپنے فکر وعمل کو اطاعت رسول کی قید سے بڑی حد تک آزادی حاصل کر لی ہے، جس سے انھیں دین اسلام کی اپنی من مانی جدید تشریح وتفہیم کی بڑی گنجائش مل گئی ہے اور اس گنجائش سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے، جو ان کی تصنیف کردہ کتابوں سے واضح ہے۔

سرسید کے اس نظریہ پر بحث ونظر

اوپر مذکور نظریہ چونکہ امور دین ودنیا کی تقسیم پر قائم ہے، ساری گفتگو کا محور

درحقیقت یہی تقسیم ہے، اس لیے اولین مرحلہ میں اس امر کی تحقیق ضروری ہے کہ امور دین اور امور دنیا میں فرق و امتیاز کا معیار کیا ہے۔(سرسید احمد خاں جو اس تقسیم کے اولین موجد ہیں یہ ان کی ذمہ داری تھی مگر انھوں نے غالبًا بعض ذہنی تحفظات کے تحت اسے واضح نہیں کیا ہے)

یہ بات تو ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ دین اور دنیا دو مختلف حقیقتیں ہیں، دونوں اپنے اپنے افعال و اثرات اور نتائج و ثمرات کے اعتبار سے بھی جدا ہیں، پھر بھی ایسا تو نہیں ہے کہ جسے عوام دین کہیں وہ دین اور جسے دنیا سمجھیں وہ دنیا ہے؛ بلکہ اس کا ایک معیار اور کسوٹی ہے، جس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا کہ دین کیا ہے اور دنیا کسے کہا جا سکتا ہے۔

دین اسلام ایک ایسی ضروری و بدیہی حقیقت ہے جسے ہر مسلمان بلکہ ہر انسان اسی طرح سے جانتا اور پہچانتا ہے جس طرح سے اسے روشن دن اور تاریک رات کا علم و فہم ہے، معمولی پڑھا لکھا بھی جانتا ہے کہ دین اسلام زندگی بسر کرنے کا وہ منہج وطریقہ ہے جس کی تعلیم اللہ رب العزت کے رسول نے وحی ربانی کی ہدایت کے مطابق بندگانِ خدا کو دی ہے، بالفاظ دیگر دین وحی ربانی سے ماخوذ وہ دستور حیات ہے جس کو اللہ کے رسول نے نوع انسانی کو بتایا اور سکھایا ہے۔

پھر ہدایت ربانی دو نوع پر مشتمل ہے: (۱) ''امر'' یعنی وحی الٰہی نے بذریعہ حکم بعض امور کو بجالانے اور انھیں زندگی میں نافذ اور جاری کرنے کو فرمایا ہے۔(۲) نہی یعنی بذریعہ وحی الٰہی بعض کاموں کے ترک اور انھیں چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے، لہٰذا جن امور و معاملات میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وہدایت بذریعہ امر و نہی ثابت و موجود ہوگی وہ لازمی طور پر امور دین ہی ہوں گے، اور جن امور اور کاموں کے بارے میں بارگاہ نبوت سے کوئی حکم وہدایت ثابت نہ ہو وہ امور دنیا میں شمار ہوں گے، دینی و دنیاوی امور میں فرق و امتیاز کا صحیح معیار یہی ہے۔

خود سرسید احمد خاں کا یہ قول تہذیب الاخلاق کے حوالہ سے ابتدائی صفحہ میں گذر چکا ہے کہ ''سچا مذہب امور دنیاوی سے تعلق نہیں رکھتا'' سرسید کے عقیدت کیش ہی نہیں؛ بلکہ ان سے سوءِ ظن رکھنے والوں کو بھی شاید اس سے انکار نہیں ہوگا کہ وہ دین اسلام کو ایک سچا دین کہتے تھے، لہٰذا خود ان کے اس قول کے مطابق بھی وہی کاروبار امور دنیا میں شامل ہوں گے جن کے بارے میں شارع نے سکوت اختیار کیا ہے، یا صراحتاً بتا دیا ہے کہ فلاں کام امر دنیا ہے شریعت کا اس سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور جو امور و معاملات شارع کے دائرۂ احکام میں داخل ہیں وہ سب کے سب دینی امور ہی ہوں گے، مثلاً ٹرین، جہاز وغیرہ کی سواری، زراعت، باغبانی، درزی کا کام، باورچی کا کام، نجّاری، آہنگری، قدیم وجدید صنعت وحرفت وغیرہ ایسے کاروبار ہیں جن سے شریعت یعنی الٰہی قوانین ساکت وخاموش ہیں، لہٰذا یہ سب کام امور دنیا میں داخل ہوں گے، اور "الاصل فی الاشیاء ھو الاباحة" کی رُو سے ہم ان میں اپنے علم وتجربہ اور عقل وفہم کے مطابق عمل میں آزاد ہوں گے۔ اس کے برخلاف مثلاً دیوانی وفوجداری کے قوانین، عائلی احکام، معاشی قوانین اور اجتماعی زندگی وسیاسی زندگی کے معاملات وغیرہ کے بارے میں احکام کتاب الٰہی وسنت نبوی میں اجمالاً وتفصیلاً مذکور ہیں اس لیے یہ سب امور دین کے دائرہ میں داخل ہیں، انھیں دین کے زمرہ سے خارج کر کے امور دنیا قرار دینا اور ان سے متعلق قرآن وحدیث کے احکام کو نظر انداز کر کے انھیں اپنی منشا ومرضی کے مطابق انجام دینا، دین سے بے خبری یا دانستہ کج روی ہے، ایک مؤمن کامل اور عقل سلیم کا حامل کیا لمحہ بھر کے لیے بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ مالک کائنات اور اس کے فرستادہ معلم انسانیت کے یہ احکام وفرامین چونکہ اس کی نظر میں امور دنیا سے متعلق ہیں، اس لیے ان پر عمل کا وہ مخاطب یا پابند نہیں ہے؛ بلکہ ان امور کو اپنی منشا کے مطابق انجام دینے میں مختار اور آزاد ہے۔

اس صحیح اور علمائے اسلام کے معمول بہ معیار کو سرسید احمد خاں نے خلاف مقصد

سمجھتے ہوئے اور اپنے مذکورہ پہلے قول سے گویا انحراف کرتے ہوئے ایک دوسرے موقع پر یوں گویا ہیں ''دنیاوی امور کا قرآن میں ذکر اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ دنیاوی معاملات بھی مذہب میں داخل ہیں'' (مقالات سرسید (۵) ص ۹)

آخر ان سے کون پوچھے کہ قرآن مبین کو دین و مذہب ہی کے احکام اور دلائل وشواہد بیان کرنے کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور قرآنی حقائق و ہدایات تک بندوں کی رسائی کے لیے اس کی تشریح و توضیح کی عظیم ذمہ داری بھی آپ کو سپرد کی گئی، لہٰذا بقول ان کے وہ دنیاوی امور و معاملات جو قرآن میں مذکور ہیں، دین و مذہب سے ان کا تعلق نہیں ہے تو قرآن ان کا ذکر کیوں کررہا ہے؟ بہر حال اس طرح کے بے سروپا دعووں سے علمی حقائق بدلا نہیں کرتے ہیں۔

کہہ رہا ہوں جنون میں کیا کیا　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

سرسید احمد خاں کی مطبوعہ تحریریں بتارہی ہیں کہ وہ دنیاوی امور کو اس قدر وسیع ترمعنی میں لیتے ہیں کہ باب عقاید، وعبادات وغیرہ کے علاوہ شعبہ ہائے زندگی کے اکثر معاملات ان کے نزدیک دنیاوی امور ہی سے متعلق ہیں، جن میں وہ قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی سے بے نیاز ہوکر اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق تصرفات کرتے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ اپنی ان تحریفات کے ثبوت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''انتم اعلم بامور دنیاکم'' کو پیش کرتے ہیں۔

آیندہ سطور میں ان کے اس استدلال بیجا پر نقد و تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

استدلال سرسید کی حقیقت

سرسید احمد خاں جب سارے دلائل وشواہد کو نظر انداز کرکے ''انتم اعلم بامور دنیاکم'' کی رو سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو تشریعی، وغیر تشریعی دو قسموں میں تقسیم کررہے تھے تو علمی وفقہی ضابطہ کے مطابق ان کی علمی

امانت ودیانت کا تقاضا تھا کہ پہلے اس امر کی بحث وتحقیق کرتے کہ اس حدیث سے جو حکم وہ اخذ کررہے ہیں، کیا تلامذۂ رسول صحابۂ کرام، تابعین عظام، فقہائے مجتہدین اور ائمہ محدثین کی جماعت میں سے کسی سے اس کا یہ معنی ومطلب منقول ہے، سلف صالحین اور اسلام میں قابل اتباع شخصیتوں کے قول سے اگر ان کے فہم کو تائید حاصل ہوجاتی تو وہ اپنے اس استدلال میں حق بجانب ہوتے، بصورت دیگر دنیائے علم ودین میں ان کی یہ رائے ازقبیل ابتداع ہی قرار پائے گی، جس کا شرعی حکم معلوم ہے ''عیاں راچہ بیاں''۔

آخر یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ قافلہ اسلام کے ہراول دستے کے علم وفہم کی رسائی ایک ایسے اصولی مسئلہ تک نہیں ہوسکی جو حدیث سے ثابت شدہ تھا اور دس گیارہ سو سال گزرجانے کے بعد غلام ملک کی غلام قوم کے ایک فرد پر اس کا انکشاف ہوگیا۔

کس صاحب عقل وہوش کو اس سے انکار ہوگا کہ بعد کی نسلوں کا دین اور تعلیمات دین کا تمام تر سرمایہ علم وہدایت کے انھیں میناروں سے مستفید ومستنیر ہے، علوم اسلام انھیں کے طریق سے ہم تک پہنچے ہیں، یہی پیشوانِ علم ودین ہماری سند اولین ہیں، لہٰذا کسی نص شرعی کا وہ مفہوم جس کا ان کے علمی دائرہ سے تعلق نہیں، اس کے جاننے کا ہمارے پاس آخر دوسرا ذریعہ کیا ہے؟

چنانچہ معروف امام حافظ شمس الدین محمد بن احمد المعروف بہ ابن الہادی المتوفی ۷۴۴ھ لکھتے ہیں:

ولا یجوز احداث تاویل فی آیة وسنة لم یکن علی عهد السلف، ولا عرفوه، ولا بینوه للامة، فان هذا یتضمن انهم جهلوا الحق فی هذا، وضلّوا عنه، واهتدیٰ إلیه هذا المعترض المستأخر، فکیف إذا کان التاویل یخالف تاویلهم و یناقضه، وبطلانه اظهر من ان یطنب فی رده، الخ (الصارم المنکی ص۲۷٤ طبع مصر)

''جائز نہیں کسی آیت یا سنت کی ایسی نو پید تاویل کرنا جس کا عہد سلف میں وجود نہیں تھا، انھوں نے نہ تو یہ تاویل سمجھی اور نہ ہی امت سے اس کو بیان کیا، کیونکہ (یہ جدید تاویل) اس بات کو متضمن ہے کہ سلف اس بارے میں حق سے جاہل رہ گئے اور بہک گئے اور یہ بعد میں آنے والا اس تک پہنچ گیا، پھر جب اس پیچھے آنے والے کی تاویل سلف کی تاویل کے مخالف ومناقض ہو تو اس نو پید تاویل کا باطل ہونا اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس کی تردید میں اطناب و تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں''

لہٰذا سرسید خاں اس حدیث کا جو مفہوم ومراد بیان کررہے ہیں، چونکہ اس میں ان کا کوئی سلف نہیں ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ ان کے ذہن فاسد اور فہم کاسد کی پیداوار ہے، جس کی سرے سے کوئی سند نہیں ہے، تو ایسی بے سند بات کی علم وعقل کی دنیا میں یہی حیثیت ہے کہ اسے باہر گلی میں پھینک دیا جائے۔

علاوہ ازیں سرسید خاں کی تعلیم وتحصیل کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ ان کا علمی سرمایہ (جو انھوں نے اپنے اساتذہ سے حاصل کیا تھا) ناقص تھا، ان کے مشہور سوانح نگار (جو سرسید کے ہواخواہوں میں سے تھے) مولانا الطاف حسین حالی کا بیان ہے:

''سرسید نے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی'' (حیات جاوید ج۲ص۴) اور خود سرسید اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ''میری نسبت لکھ دینا کہ بہت ذی علم وفاضل اکمل ہیں کیسی غلط بات ہے'' (مکتوب سرسید جلد۲ ص۱۷۵) ظاہر ہے ایسا ادھورے علم کا حامل، جب اپنی کم علمی کے باوجود قرآن وحدیث کی نصوص میں دخل اندازی کرے گا تو اس کے فکر وقلم سے کیسے کیسے افسوسناک عجائب وغرائب رونما ہوں گے ان کی تحریروں سے، اس کا اندازہ ہر صاحب علم وفہم کو ہوسکتا ہے۔

اس اصولی گفتگو کے بعد آیئے سرسید خاں کے استدلال واستنباط پر نظر

ڈالیں، لیکن اس سے پہلے کہ ہم ان کے استدلال کو علمی قواعد واصول کے معیار پر پرکھیں، ایک اہم نکتہ کا ذکر ضروری ہے جس سے زیر بحث مسئلہ کی تفہیم میں انشاء اللہ سہولت وآسانی ہوگی۔

ایک اہم نکتہ

یہ امر قرآن وحدیث سے ثابت مسلمات میں سے ہے کہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی دو مستقل حیثیتیں ہیں، ایک آپ کی حقیقت بشریت ہے، اور دوسری آپ کی حقیقت نبوت ورسالت۔ چنانچہ قرآن حکیم میں خود آپ کی زبان وحی ترجمان سے یہ ابدی وسرمدی اعلان کرایا گیا، "قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ، یُوحَیٰ اِلَیَّ" (الکہف) اے محمد کہہ دیجیے (اے بنی نوع بشر) میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں، (البتہ دیگر بشر سے اللہ رب العزت نے مجھے یہ امتیاز واعزاز بخشا ہے کہ) میری طرف وحی ربانی کا نزول ہوتا ہے۔

(الف) آپ اپنی بشری حقیقت میں سارے انسانوں کے ہم جنس اور ان کے مساوی اور برابر ہیں: "اِنّما اَنَا بَشرٌ مِثْلُکم" کلام الٰہی یہی بتا رہا ہے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، "انما انا بشر انسی کما تنسون" میں ایک بشر ہی ہوں بھولتا ہوں جس طرح تم لوگ بھولتے ہو (رواہ احمد، وابوداؤد، والنسائی) لہٰذا اس بشری حقیقت سے آپ کا ظن وگمان دوسرے انسانوں کی طرح صواب یا خطا سے متصف ہوسکتا ہے۔ "الظن یخطی ویصیب" اسی طرح بحکم بشریت بعض امور دنیا میں آپ کی بیان کردہ خبر خلاف واقع ہوسکتی ہے، کیونکہ خبر بذاتہ صدق وکذب کی متحمل ہے، یوں ہی آپ کا حکم غیر جازم، یا آپ کا مشورہ، یا آپ کی رائے وتجویز جو وحی الٰہی سے مؤید نہ ہو یہ سب امور بربنائے بشریت ہی واقع ہوتے ہیں کتب حدیث صحاح، سنن، مسانید وغیرہ میں ان سب کی مثالیں

موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے صادر یہ سب صورتیں واجب الاتباع نہیں ہیں، کیونکہ یہ سارے الفاظ اپنی اصل وضع کے لحاظ سے خود بتارہے ہیں کہ جن امور کے بارے میں آپ یہ الفاظ استعمال فرمارہے ہیں حقیقتاً نبوت ورسالت سے ان کا تعلق نہیں ہے، وحی الٰہی کی ترجمانی وتنفیذ میں ظن وشک یا مشورہ وتجویز کی گنجائش ہی کہاں ہے، وحی الٰہی سے ثابت حکم تو اپنی قطعیت میں جملہ قطعیات سے بلندتر اور محکم ترین ہوتا ہے، اور آپ امت سے بے چون و چرا اس کی تعمیل کراتے تھے۔

(ب) شخصیت محمدی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی دوسری حقیقت نبوت ورسالت کی ہے۔ اس حیثیت سے جو خبر آپ دیں گے وہ یقینی طور پر سچی، واقع کے مطابق ہوگی اس میں تخلف ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ یہ تو خود خدائے علیم وخبیر کی فرمودہ ہوتی ہے، اسی طرح بحق رسالت جو حکم آپ جاری فرمائیں گے بغیر کسی شرط وقید کے اس کی بجا آوری لازم ہوگی، لہٰذا امور دین میں بھی آپ کے حکم کا امتثال واجب ہوگا اور امور دنیا میں بھی اس سے انحراف اور روگردانی قطعی طور پر جائز ودرست نہیں ہوگی۔

امام بدرالدین محمود عینی متوفی ۸۵۵ھ رقمطراز ہیں:

”والتحقیق فیه ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم له حالتان: حالة مطلق البشریة! فهو وسائر الناس فیه سواء، والدلیل علیه قولهؐ ”انا بشر مثلکم“ لانه من جنسهم ولیس من جنس غیرهم، فبالنظر الی هذه حالة ربما یظن امرًا و قد کان الواقع خلافه، لان الظن یخطی ویصیب کما فی سائر الخلق.

والحالة الاخریٰ التی هی زائدة علی تلك الحالة وهی! کونه نبیًا ورسولاً من الله معصومًا فی قوله وفعله؛ بحیث انه اذا قال قولًا او فعل فعلاً فهو الحق عند الله تعالیٰ، ولا یقع خلافه اصلاً، لانه من اللّٰه تعالیٰ

وعليه قوله تعالىٰ: "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الهوىٰo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" غير ان الوحى قسمان: احدهما متلو هو القرآن، والآخر غير متلو وهو اقواله وافعاله التى فى ابواب التشريع" (نخب الافكار فى تنقيح مبانى الاخبار فى شرح معانى الآثار ج ١٤ ص٣٨٨)

اس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت مطلق بشریت کی ہے، آپ اور سارے انسان اس میں یکساں ہیں، اس کی دلیل یہ فرمان ہے: "انا بشر مثلکم" ''میں تمہاری طرح کا بشر ہوں'' کیونکہ آپ جنس بشر سے ہیں، غیر بشر کی جنس سے نہیں ہیں لہٰذا اس حالتِ بشری کے تحت آپ کبھی ایک چیز کا گمان کرتے ہیں جبکہ واقعہ اس کے برخلاف ہوتا ہے، اس لیے کہ ظن خطاء بھی کرتا ہے اور درستگی کو بھی پہنچتا ہے جیسے تمام انسانوں کے ظن میں ہوتا ہے۔

اور دوسری حالت جو اس پہلی حالت سے زائد ہے، اور یہ آپ کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی، رسول اور اپنے قول وفعل میں معصوم ہونا ہے بایں حیثیت کہ آپ نے جب کوئی بات فرمائی یا کوئی کام کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق وصواب ہی ہے، اور یہ خلاف واقع قطعی نہیں ہوگا کیونکہ یہ (قول وفعل) اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، اسی بناء پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰo اِن هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" اور اللہ کا رسول اپنی خواہش سے نہیں بولتا، یہ تو بس وحی ہی ہے جو ان کو کی گئی ہے۔

البتہ وحی کی دو قسمیں ہیں: ایک متلو اور یہ قرآن ہے، اور دوسری باب تشریع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال ہیں۔

اسی مفہوم کو امام ابو العباس قرطبی متوفی ٦٥٦ھ نے ''المفہم ج٦ ص ١٦٩ میں اور امام ابن تیمیہ نے مجموع فتاوی ج ١٨ ص ١١-١٢ میں، نیز دیگر شراح نے بھی بیان کیا ہے بغرض اختصار ان کی عبارتیں درج نہیں کی گئی ہیں۔

واقعہ تأبیر نخل سے متعلق احادیث کی تحقیق

ارباب علم ونظر کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ تابیر نخل (درخت خرما میں قلم لگانا) کا زیر بحث واقعہ ایک بار ہی پیش آیا ہے اور اسی قصۂ واحد کو چار صحابہ روایت کررہے ہیں: (۱) حضرت طلحہ بن عبیداللہ (یکے از عشرہ مبشرہ) (۲) حضرت رافع بن خدیج (۳) حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ (۴) حضرت خادم رسول انس بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین۔

چونکہ انسانی قدرت اور بس سے یہ باہر ہے کہ کسی ایک واقعہ کو متعدد افراد ذکر کریں اور اس کے بیان میں سب کے الفاظ یکساں ہوں؛ بلکہ معنی ومراد میں وحدت کے باوجود تعبیر میں اختلاف ناگزیر ہے، کچھ اسی طرح کی صورت حال قصۂ تابیر نخل کے تذکرہ میں بھی پیش آئی ہے کہ اوپر مذکور حضرات صحابہ ایک ہی قصہ کا ذکر کررہے ہیں؛ لیکن ان کے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اگرچہ سب کی مراد ومنشا ایک ہی ہے اس طرح کے مواقع میں اصولی اعتبار سے یہ رویہ درست نہیں ہے کہ بقیہ سب روایتوں کو یکسر نظر انداز کرکے صرف ایک روایت کے الفاظ پر کلی اعتماد کرلیا جائے؛ بلکہ قاعدۂ مسلمہ "الحديث يفسر بعضه بعضاً" کے مطابق واقعہ سے متعلق روایت کا وہی معنی ومفہوم صحیح ہوگا جس میں سب روایتوں کی رعایت ملحوظ رکھی جائے۔

اس مختصر مگر ضروری تمہید کے بعد آیئے قصۂ تابیر نخل کے بارے میں وارد متون احادیث کو ملاحظہ کریں، کیونکہ سرسید احمد خاں نے اپنے نظریہ کی بنیاد اسی واقعہ سے متعلق ایک روایت کو بنایا ہے۔

(۱) عن موسیٰ بن طلحة عن ابيه قال: مررت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بقوم على رؤس النخل، فقال: ما يصنع هؤلاء؟ قالوا: يُلَقّحونه، يجعلون الذكر فى الانثى فتلقّح، فقال رسول الله صلى الله

عليه وسلم: ما اظن يغنى ذلك شيئًا، قال: فاخبروا بذلك فتركوه، فأُخبِر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بذلك، فقال: ان كان ينفعهم ذلك فليصنعوه، فانّي انما ظننتُ ظنًا، فلا تؤاخذونى بالظن، ولكن اذا حدّثتُكم عن اللّٰه شيئًا فخذوا به فانى لن اكذب على اللّٰه عزوجل. (صحيح مسلم ج۲ ص۲٦ مع شرح النووى مطبوعه المكتبة الاشرفيه بديوبند)

ترجمہ: موسیٰ بن طلحہ اپنے والد طلحہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ میرا گذر ایک قوم کے پاس سے ہوا جو کھجور کے درختوں کی چوٹیوں پر تھے، آپؐ نے دریافت کیا، یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ لوگوں نے کہا قلم لگا رہے ہیں (یعنی) نر درخت (کا شگوفہ) مادہ درخت (کے شگوفہ) میں ڈال رہے ہیں، جس سے مادہ درخت اثر پذیر ہوتا ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں گمان نہیں کرتا کہ یہ عمل کچھ مفید ہوگا۔ راوی حدیث طلحہ کہتے ہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بات کی قلم لگانے والوں کو خبر دی گئی تو انھوں نے اس کام کو چھوڑ دیا (تو پھل ردی آئے) جس کی اطلاع آپؐ کو دی گئی تو فرمایا کہ اگر یہ عمل ان کے لیے نفع بخش ہے تو اسے کریں، یقیناً میں نے تو بر بنائے ظن ہی کہا تھا، لہٰذا تم لوگ اس ظن کی بناء پر مجھے معاف رکھو (یہ آپ نے محض اخلاق کریمانہ کی وجہ سے فرمایا ورنہ انصار صحابہ کو تو ادنیٰ شکایت بھی نہیں تھی) لیکن جب میں تم سے منجانب اللہ کوئی بات کہوں تو اس پر ہی عمل کرو بیشک مجھ سے ہرگز اللہ پر غلط بیانی نہیں ہوسکتی (یعنی جو منجانب اللہ کہوں گا وہ برحق ہوگا)۔

(۲) عن رافع بن خديج قال: قدم النبى صلى اللّٰه عليه وسلم المدينة وهم يأبِرُون النخل، ويقول يلقّحون النخل، فقال: "ما تصنعون؟" قالوا: كنا نصنعه، قال: لعلكم لو لم تفعلوا كان خيرًا، قال:

فتركوه فنفضتُ، او قال: فنقصت قال: فذكروا ذلك له فقال: انما انا بشر، اذا امرتكم بشيء من دينكم فخذوا به، واذا امرتكم بشيء من رأى فانما انا بشر. (صحيح مسلم ج۲ ص ۲٦٤)

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ (ہجرت کرکے) تشریف لائے، جبکہ اہل مدینہ درخت خرما میں پیوندکاری کرتے تھے، یعنی تلقیح کرتے تھے، آپؐ نے پوچھا تم کیا کرر ہے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ (زمانہ قدیم سے) ہم اس کو کرتے ہیں، آپ نے فرمایا ہوسکتا ہے کہ اگر تم نہ کرو تو بہتر ہو، انھوں نے اس کو ترک کردیا تو پھل (قبل ازوقت) گرگئے، یا کہا پھل کم آئے راوی نے کہا پھلوں کی اس خرابی کا ذکر لوگوں نے آپؐ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: "انّما انا بشر" میں بشر ہی ہوں (ہاں بحیثیت رسول) جب میں تمہیں حکم دوں تو اس پر (لازماً) عمل کرو اور جب کسی امر دنیا کے بارے میں اپنے ذاتی ظن ورائے سے حکم دوں تو میں ایک بشر ہوں (یعنی) دوسرے بشر کی طرح میرے ظن میں بھی خطاء یا صواب کا وقوع ہوسکتا ہے۔

تشریح: حضرت طلحہ اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہما کی روایتوں سے تین باتیں مستفاد ہورہی ہیں:

(الف) ان دونوں حدیثوں کے الفاظ اس بارے میں صریح ہیں کہ تابیر نخل (درخت خرما میں پیوندکاری) سے متعلق آپؐ نے جو کچھ بھی فرمایا وہ اپنے ظن وخیال سے فرمایا تھا، وحی الٰہی پر اعتماد کرتے ہوئے یہ بات نہیں کہی تھی، چنانچہ حضرت طلحہ کی روایت میں آپ صاف طور پر فرمارہے ہیں "ما اظن يغني ذلك شيئًا" اور حضرت رافع کی حدیث کے الفاظ ہیں "لعلكم لو لم تفعلوا كان خيرًا" عربی زبان کی معمولی شدبد رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ لفظ "ظن" امور غیر یقینی اور گمان وخیال کے معنی میں بولا جاتا ہے اور لفظ "لعل" شاید، امید ہے کہ، ممکن ہے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، تابیر نخل سے متعلق اگر آپ کا یہ فرمان

بر بنائے وحی ربانی ہوتا تو ''اظن'' میرا گمان ہے، یا ''لعل'' (شاید) کے الفاظ قطعی طور پر نہ فرماتے؛ کیونکہ وحی کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قطعی ہوتا ہے۔اس کی ترجمانی میں ظن وخیال کی گنجائش ہی نہیں ہے، لہٰذا یہ دونوں الفاظ اپنے سننے والوں کو یقینی طور پر بتارہے ہیں کہ آپؐ نے اس موقع پر جو کچھ بھی فرمایا وہ وحی سماوی کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ اپنے ذاتی وشخصی ظن وخیال کی بناء پر فرمایا تھا۔

(ب) یہ حدیث پاک ہمیں اس بات پر بھی متنبہ کررہی ہے کہ آپؐ جس بات کو صیغۂ ظن وشک سے بیان کریں، اس میں اور جو بات جزم ویقین کے الفاظ میں آپ سے صادر ہوئی ہے دونوں میں لازمی طور پر فرق وامتیاز ہوگا، پہلی بات از قبیل ذاتی ظن کے ہوگی اور دوسری وحی الٰہی سے مستفاد ہوگی۔

(ج) تابیر نخل کے اس واقعہ میں غلطی دراصل انصار صحابہ سے ہوئی کہ انھوں نے جذبۂ اتباع کامل کے جوش میں آپ کے شخصی ظن کو گویا وحی کا درجہ دے کر اپنے پشتینی علم وتجربہ کو پس انداز کرکے تابیر نخل کے عمل کو ترک کردیا، کما صرح الحافظ ابن تیمیة والرسول صلى الله عليه وسلم لم ينههم فى التلقيح ولكن غلطوا فى ظنهم انه ...... (فتاوی ابن تیمیه ج۱۸ ص۱۲)

غور کیجیے یہاں مقابلہ امر دین اور امر دنیا کا نہیں ہے؛ بلکہ وحی ربانی اور ذاتی ظن کا ہے، معلوم ہوا کہ جو حکم وخبر آپ سے بصیغۂ جزم ویقین صادر ہوگی وہ بحیثیت رسالت وحی ربانی کا اظہار وبیان ہوگا چاہے اس کا تعلق امر دین سے ہو یا امر دنیا سے اس میں قطعی طور پر تخلف نہیں ہوگا اور اس امر وخبر کا امتثال وتصدیق امت پر لازم ہوگی، اس میں کسی قسم کے چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے اور جو امر وخبر آپ بالفاظ ظن وشک بیان فرمائیں وہ درحقیقت بشری حیثیت سے اپنے ظن وخیال کا اظہار ہے، لہٰذا ایسی خبر میں تخلف بھی ہوسکتا ہے اور بحکم حدیث اس پر عمل آوری بھی ضروری نہیں ہوگی۔

مشہور امام حدیث ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی متوفی ۳۲۱ھ شرح معانی الآثار

میں حضرت طلحہؓ کی حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: "فاخبر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی ھذا الحدیث: ان ما قالہ من جھۃ الظن فھو فیہ کسائر البشر فی ظنونھم، وان الذی یقولہ مما لا یکون علی خلاف ما یقولہ ھو ما یقولہ عن اللّٰہ عزّ وجل"

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ آپ نے جو بات بطور ظن کے فرمائی ہے، تو اس ظنی قول میں آپؐ سارے انسانوں کی طرح ہیں، اور آپؐ کے جس قول کا خلاف واقع ہونا ممکن نہیں، یہ وہ قول ہے جس کو آپ اللہ عز وجل کی جانب سے کہتے ہیں"

غور کیجیے امام طحاوی ظن اور وحی کے مابین فرق کر رہے ہیں، دنیا اور دین کے درمیان نہیں۔

حافظ بدرالدین عینی متوفی ۸۵۵ھ امام طحاوی کے اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ان نھیہ عن تأبیر النخل کان عن ظن ظنہ، ولم یکن من طریق الوحی، اذا الذی یقولہ من طریق الوحی لا یکون علی خلاف ما یقولہ، وقد صرح فی حدیث التأبیر بقولہ: "انما ھو ظن ظننتہ" وصرّح بان الظن یخطی ویصیب، فدلّ ذلک ان ما قالہ من جھۃ الظن فھو کسائر الناس فی ظنونھم، واما الذی یقولہ ولا یخالف فیہ فھو الذی یقولہ عن اللّٰہ تعالیٰ، لان ما کان عن اللّٰہ لاخلاف فیہ، ولا یقع ما ھو خلافہ"
(نخب الافکار شرح شرح معانی الآثار ج ۱٤ ص ۳۸۷)

ترجمہ: آپؐ کا تابیر نخل سے منع کرنا از روئے گمان تھا جو آپ نے کیا، بطور وحی کے یہ ممانعت نہیں تھی، کیونکہ جو بات آپ بطریق وحی فرمائیں گے وہ بات آپ کے فرمان کے خلاف نہیں ہو سکتی ہے، اور آپ نے حدیث تابیر نخل میں صراحت کر دی تھی کہ میں نے جو کچھ کہا وہ اپنے ظن کے مطابق کہا، اور آپؐ نے اس کی بھی

تصریح فرمادی ہے کہ "الظن یخطی ویصیب" ظن میں خطا بھی ہوتی اور درستگی بھی، لہٰذا معلوم ہوا کہ آپ جو بات بطور ظن کے کہیں گے اس میں آپ کا ظن دیگر سارے لوگوں کے ظن کی طرح ہوگا، البتہ آپ کا وہ قول جس کے خلاف کا وقوع نہیں ہوسکتا آپ کا وہ قول ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرماتے ہیں، کیونکہ جو چیز منجانب اللہ ہوتی ہے اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، اور نہ اس قول کے خلاف کا وقوع ہوسکتا ہے۔

(۳) عن عائشة وعن انس ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم مرّ بقوم یلقّحون، فقال: لو لم تفعلوا لصلح، قال: فخرج شیصًا، فمر بهم، فقال: ما لنخلکم؟ قالوا: قلت کذا وکذا، قال: انتم اعلم بامر دنیاکم. (صحیح مسلم ج۲ ص۲٦٤)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک ایسی جماعت پر ہوا جو درخت خرما میں پیوند لگا رہی تھی، تو آپ نے فرمایا اگر تم لوگ نہ کرو تو البتہ بہتر ہو، راوی کا بیان ہے (کہ انھوں نے اسے ترک کردیا) تو پھل ردّی آئے، دوبارہ آپ ان کے پاس سے گزرے تو پوچھا تمہارے درختوں (کے پھل) کو کیا ہوگیا؟ انھوں نے عرض کیا آپ نے یہ یہ فرمایا تھا (یعنی آپ کے فرمان لو لم تفعلوا لصلح کی وجہ سے ہم نے پیوندکاری ترک کردی تو پھل ردّی اور خراب ہوگئے) آپ نے فرمایا تم اپنے امر دنیا (یعنی باغبانی) کو زیادہ جانتے ہو۔

تشریح: رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے "انتم اعلم بامر دنیاکم" کو منفرداً و مستقلاً یعنی تنہا مستقل طور پر نہیں فرمایا ہے؛ بلکہ جس وقت یہ فرمایا تھا تو اسی کے ساتھ یہ بھی صراحت فرمادی تھی کہ میں نے تابیر کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ محض اپنے ظن کی بنیاد پر کہا تھا "انما ظننتُ ظنا" لہٰذا اس سیاق کے لحاظ سے اس حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں جب امر دنیاوی کے بارے میں اپنے ظن وگمان سے

کوئی بات کہوں اور تمہارے پاس اس امر دنیا کے متعلق علم یقینی ہو تو تم میرے ظن کے بجائے اپنے علم و یقین پر عمل کرو۔

حدیث کے سیاق سے معلوم ہو رہا ہے کہ ''انتم اعلم بامر دنیا کم''قاعدہ عامّہ اور حکم کلی نہیں ہے؛ بلکہ ایک واقعہ خاص کی صورت حال کا بیان ہے، کیا ایک عالم و فاضل اور صاحب علم و حکمت کے بارے میں یہ تصور صحیح ہوگا کہ کاروبار دنیا سے تعلق رکھنے والے سارے افراد تمام امور دنیاوی میں اس سے علم و تجربہ میں بڑھے ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں تو پھر اللہ کے منتخب رسول مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ کیسے سوچا جاسکتا ہے کہ دنیا کا ہر شخص امور دنیا کے علم میں آپ سے بڑھا ہے، کیونکہ ہر شخص کے علم و تجربہ میں امور دنیا میں سے کچھ نہ کچھ یقینیات لازمی طور پر ہوتی ہیں جس میں وہ دوسروں کے مساوی اور برابر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں منصب نبوت و رسالت سے قطع نظر آپ عقل و فہم کے جس معیار اعلیٰ پر فائز تھے، اس کے تحت دنیا کے بہت سارے امور دیگر اہل عقل و تجربہ کے مقابلے میں بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے جیسا کہ آپ کی سیرت مقدسہ اور حیات طیبہ سے ظاہر و باہر ہے۔ اس لیے سر سید احمد خاں اور ان کے فکری تلامذہ کو جو اس حدیث کو اس کے سیاق سے الگ کر کے بطور قاعدہ کلیہ کے پیش کر رہے ہیں انھیں سو بار سوچنا چاہیے تھا کہ وہ اللہ کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر اعظم کو بزعم خویش کیا مقام و درجہ دے رہے ہیں۔

اس موقع پر اس واقعی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ بات تو سب لوگ یقینی طور پر جانتے ہیں کہ حیوانات میں مذکر و مونث کا مخصوص اجتماع عادتاً حصول نتیجہ کا سبب ہے، البتہ نباتات یعنی درختوں وغیرہ میں بھی یہ قربت مؤثر و مفید ہے کہ نہیں تو جو لوگ باغبانی کے پیشہ سے وابستہ ہیں انھیں اپنے دیرینہ تجربہ کی بناء پر معلوم ہے کہ حیوانات کی طرح نباتات میں بھی مذکر و مونث کی یکجائی عادتاً سود مند اور نفع بخش ہے، جبکہ عام افراد یہی سمجھتے ہیں کہ درختوں میں یہ کارآمد نہیں

ہے، چونکہ آپ ﷺ کو باغبانی وغیرہ کا تجربہ مطلقاً نہیں تھا اس لیے عام فہم انسانی کے مطابق آپ کو بھی یہی خیال اور گمان ہوا کہ تابیر نخل کا یہ عمل مفید نہیں ہے، آپ کا یہ ظن قطعاً بے محل نہیں تھا، انصار صحابہ کو اپنے پشتینی تجربہ سے معلوم تھا کہ یہ عمل فائدہ مند ہے، آپ نے اپنے ذاتی ظن اور شخصی خیال کے مقابلہ میں ان کے تجرباتی علم کی تائید کرتے ہوئے فرمایا "انتم اعلم بامر دنیاکم"

پس اتنی بات کو یاروں نے افسانہ بنا ڈالا

(۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی قصہ سے متعلق ایک اور حدیث بھی مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

عن عائشة ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم سمع اصواتًا، فقال: ما هذه الاصوات؟ قالو: النخل یؤبرونه یا رسول اللّٰه، فقال: لو لم یفعلوا لصلح، فلم یؤبروا عامئذٍ فصار شیصًا فذکروا ذلك للنبی صلی اللّٰه علیه وسلم فقال: اذا کان شیئًا من امر دنیاکم فشاکم به، واذا کان امر دینکم فالّی. (مسند احمد ج۲ ص۱۲۳ وابن ماجه رقم الحدیث ۲٤۷۱)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آوازیں سنی تو فرمایا یہ کیسی آوازیں ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ درخت خرما میں قلم لگا رہے ہیں، پس آپ نے (بربنائے ظن) فرمایا اگر (یہ عمل) نہ کریں تو مناسب ہے، چنانچہ اس سال لوگوں نے تابیر نہیں کی، تو پھل ردی ہو گئے، پھلوں کی اس کیفیت کا ذکر صحابہ نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو آپ نے فرمایا اگر کوئی کام تمہاری دنیا کا ہو تو وہ تمہارے علم کے سپرد ہے اور جب کوئی امر دینی ہوگا تو وہ میری طرف ہی محول ہوگا۔

نوٹ: حضرت عائشہ اور انسؓ سے مروی حدیثوں میں اگرچہ ظن کا ذکر نہیں ہیں؛ لیکن قاعدہ مسلمہ الناطق یقضی علی الساکت کے مطابق ان حدیثوں

میں بھی یہ ملحوظ ہوگا۔

تشریح: اگلے سطور میں صحیح مسلم کے حوالہ سے مذکور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اور زیرنظر ان کی یہ حدیث دراصل ایک ہی حدیث ہیں اختلاف سند کی بنا پر الفاظ میں کچھ فرق اور کمی وزیادتی ہوگئی ہے۔

اس موقع پر بطور خاص یہ بات غور طلب ہے کہ زیرنظر احادیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ''امور دنیا'' سے کن امور کو مراد لیا ہے، جن میں امت کو اپنے علم و تجربہ کی بنیاد پر عمل کی اجازت اور آزادی عطا فرمائی ہے، پورے ذخیرۂ حدیث میں صحیح سند سے ثابت اس کی صرف ایک ہی ایسی مثال ملتی ہے جس کے بارے میں کسی نزاع واختلاف کی گنجائش نہیں ہے اور وہ یہی زیر بحث تابیر نخل یا بالفاظ دیگر تلقیح نخل ہے، جو باغبانی کا ایک عمل ہے، پھر اس مثال واحد کے سلسلے میں بھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی امر جازم یا خبر یقینی کا صدور نہیں ہوا ہے؛ بلکہ اس کے متعلق آپ نے جو کچھ بھی فرمایا تھا وہ درحقیقت اپنے ذاتی ظن وخیال کا اظہار تھا، لہٰذا باغبانی کے بارے میں یہ حدیث اس معنی میں نص ہے کہ امت اس میں اپنے علم و تجربہ کے مطابق عمل میں آزاد ہے، علاوہ ازیں دیگر کاروبار جو باغبانی سے قریب درجہ کی مشابہت رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں شریعت (یعنی قوانین الٰہی جو رسول اللہ کے ذریعہ جاری ہوئے ہیں) کوئی حکم جاری کرنے سے خاموش ہے تو وہ معاملات اور کاروبار بھی از روے قیاس امور دنیا میں شامل سمجھے جاسکتے ہیں، جیسے فلاحت وزراعت، آہنگری، نجّاری اور اسی نوع کی دیگر قدیم و جدید صنعت وحرفت، چنانچہ کتب حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول کوئی ایسی خبر نہیں ملتی جن میں آپ نے ان پیشوں کے طریقے تعلیم فرمائے ہوں، احادیث رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں ان جیسے امور کے متعلق احکام وہدایات کا نہ پایا جانا بتارہا ہے کہ یہی وہ امور دنیا ہیں جن میں شریعت (احکام ربانی) نے عدم مداخلت کرکے ہمیں آزادی دے دی ہے کہ ہم ان کو اپنے علم و

تجربہ کے مطابق انجام دیں۔

ان کے علاوہ وہ امور ومعاملات جن سے احکام الٰہی وابستہ ہیں، مثلاً خرید وفروخت، مداینت اور قرض کے معاملات، ربا اور سود کے کاروبار، دیوانی و فوجداری کے مسائل، عائلی، معاشرتی اوراجتماعی زندگی کے معاملات، کھانے پینے، پہننے وغیرہ کے آداب وطریقے وغیرہ وہ امور ہیں جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں کثرت سے ہدایات واحکام (اوامر ومناہی) وارد ہوئے ہیں یہ سب درحقیقت دینی امور ہی ہیں کیونکہ جن امور سے متعلق شریعت کا کوئی امر وحکم ہوتا ہے، انھیں کو دینی کام سمجھا اور کہا جاتا ہے۔

پھراس بات سے بھی کوئی مردمؤمن اورعقل سلیم سے متصف انسان انکار نہیں کرسکتا ہے کہ شریعت (قوانین الٰہی) جن معاملات میں بھی مداخلت کرتی ہے اسے اس کا مطلق حق ہے، اوراس مداخلت کی کامل ترین (جس کے اوپر کمال کا کوئی درجہ نہیں) صلاحیت بھی اسے حاصل ہے، کیونکہ مالک کائنات باری تعالیٰ علیم وحکیم ہے، وہ ہمارے منافع ومضار کو ہم سب سے (انفراداً واجتماعاً) زیادہ جانتا ہے، اس نے جن معاملات وامور میں بھی کوئی حکم دیا ہے وہ اپنے قصد وارادہ سے دیا ہے اور ہم پراس حکم کا امتثال اور پیروی بغیر کسی چون و چرا کے لازم ہے، کیونکہ وہ ہمارا خالق ومالک ہے اور ہم اس کی مخلوق اور بندہ ہیں اور بندوں کو آقا کے حکم کی بجا آوری میں اختیار نہیں ہوا کرتا کہ چاہے تو اس پر عمل کریں اور جی میں آئے تو چھوڑ دیں، یہاں کسی آزادی کی گنجائش نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام: تابیر نخل کے قصہ سے متعلق متعدد سندوں سے وارد احادیث کے معنی ومراد کی یہ تشریح وتوضیح درحقیقت متقدمین علمائے حدیث وفقہ کے بیان ہی کی ترجمانی ہے، جس سے صاف طور پر معلوم ہوگیا کہ یہاں تقسیم ظن اوروحی کے درمیان ہے دین ودنیا کے درمیان تقسیم کا یہاں ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہے، یایوں کہیے کہ سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت ورسالت کے درمیان فرق

کا معاملہ ہے یعنی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اگر اپنے بشری وذاتی خیال سے کوئی بات فرمائیں، یا مشورہ دیں، یا کسی معاملہ میں کوئی رائے قائم فرمائیں (جس کی توثیق منجانب اللہ نہیں ہوئی ہے) تو امت پر ان کی تعمیل واجب نہیں ہوگی، بلکہ امت کو اس میں اختیار ہوگا، ذاتی وبشری ظن وخیال کے متعلق اس اختیار کی دلیل یہی تابیر نخل سے متعلق حدیث ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ کا حکم بریرہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے جو کتب صحاح وسنن وغیرہ میں مذکور ہے، حضرت بریرہ باندی تھیں اوراسی غلامی کے زمانہ میں ان کا عقد نکاح مصعب نامی ایک صحابی سے ہوا تھا، بعد میں وہ آزاد ہوگئیں تو بحکم شرع انھیں یہ اختیار حاصل ہوگیا کہ اگر وہ چاہیں تو عہد غلامی کے نکاح کو فسخ کرسکتی ہیں، انھوں نے اپنے اس اختیار کو استعمال کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے شوہر مصعب رضی اللہ عنہ اس سے بیحد پریشان ہوئے، اللہ کے رسول نے ان کی اس پریشان حالی کو دیکھا تو بریرہ سے بقائے نکاح کے سلسلہ میں گفتگو کی، انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ حکم ہے یا مشورہ؟ آپ نے فرمایا مشورہ ہے، یہ سن کر بریرہ نے کہا اب مجھے اختیار ہے کہ اس مشورہ پر عمل کروں یا نکاح کو اپنے ارادہ کے مطابق فسخ کردوں۔

اسی طرح مسند بزار اور معجم کبیر طبرانی میں بسند حسن روایت ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر مسلمانوں کی دشواریوں کو دیکھ کر بطور حربی تدبیر کے آپ کی رائے ہوئی کہ قبیلۂ غطفان کے لوگوں سے مدینہ کی نصف کھجوروں کے عوض یہ مصالحت کرلی جائے کہ وہ مشرکین مکہ کا ساتھ چھوڑ کر اپنے گھروں کو واپس لوٹ جائیں۔ بنوغطفان سے یہ معاملہ طے کے قریب تھا کہ آپ نے اس کی اطلاع انصار کے بعض اہم افراد کو دی، جسے سن کر انھوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! وحی من السماء؟ فالتسليم لامر الله، او من رأيك وهواك؟ فرأينا تبع لهواك ورأيك، فان كنت انما تريد الا بقاء علينا، فوالله لقد رأيتنا واياهم سواء ما ينالون تمرة إلا بشرى او قِرى'' یا رسول اللہ یہ حکم سماوی ہے کہ اللہ کے حکم پر

سرتسلیم خم ہے، یا آپ کی رائے اور خواہش ہے کہ ہماری رائے وخواہش آپ کی خواہش کے تابع ہے اور اگر آپ کا یہ ارادہ محض ہم پر شفقت کی بنا پر ہے تو آپ ہمیں ان سے کمتر نہیں پائیں گے وہ ایک کھجور بھی بغیر خرید کے یا میزبانی کے نہیں لے سکتے ہیں۔

اس واقعہ سے بھی یہی ثابت ہورہا ہے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے ومشورہ اور وحی سماوی کے درمیان عملاً فرق سمجھتے تھے، کہ وحی سماوی کو واجب التسلیم اور آپ کے ذاتی مشورہ اور رائے کو اختیاری باور کرتے تھے کہ آپ کے مشورہ کے وقت اپنا مشورہ بھی پیش کرتے تھے۔

بحیثیت بشریت آپ کے ظن، مشورہ اور رائے (جس کی توثیق وحی سے نہیں ہوتی ہے) اور بحیثیت رسالت آپ کے حکم کے درمیان یہ فرق وامتیاز تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ثابت ہے۔

رہا معاملہ دین ودنیا کے درمیان تقسیم کا کہ دینی امور میں آپ کا حکم واجب التعمیل اور دنیاوی امور میں اختیاری ہے، تو یہ صرف اور صرف سرسید احمد خاں کے فکری کجی کا نتیجہ ہے، جس کا دین اسلام میں کوئی ثبوت نہیں ہے، سرسید خاں چونکہ اپنے عہد کے یورپ بالخصوص برطانیہ کی دنیاوی ترقی سے بیحد مرعوب تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ مسلمان جب تک یورپین تہذیب وتمدن میں ڈھل نہیں جاتے ترقی نہیں کرسکتے ہیں، اپنے اسی مرعوب فکر کے تحت وہ اسلام کی ایسی جدید تفسیر وتعبیر کے درپے تھے جس سے اسلام اپنے فکر وعمل میں یورپ کا نقش ثانی بن جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے پیش رو منحرفین کی طرح انھیں بھی اپنے راستہ سے حدیث وسنت کو ہٹانا ضروری تھا، حدیث وسنت کی علی الاطلاق حجیت اور تشریعی حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ وہ دین اسلام میں جدید پیوندکاری نہیں کرسکتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی خودساختہ اور من گھڑت تقسیم کے ذریعہ حدیث رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے ایک بڑے حصہ کی تشریعی حیثیت کا انکار کردیا، ان کے

اسی رویہ پر اکبرالہٰ آبادی نے یہ تبصرہ کیا تھا۔

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کردیا گم کعبہ کو اور کلیسا نہ ملا

"فالی اللہ المشتکی" وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین.

حبیب الرحمٰن اعظمی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
۲۰؍ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ